ریاستی تربیت، معذوری اور غریب الوطنی

تحریر: سہیل احمد لون

گزشتہ دنوں میں چھٹیاں گزارنے ہمشیرہ کے پاس ہالینڈ گیا۔اس کے چار بچوں میں سے ایک بیٹا علی تیمور ذہنی اور بیٹی زینہ رباب جسمانی معذور ہیں۔میں ان بچوں سے چند برس قبل پاکستان میں بھی ملا تھا جہاں زینہ احساس کمتری میں اس قدر مبتلا تھی کہ مجھے گھر میں دیکھ کر دوسرے کمرے میں جا کر چھپ گئی اور میرے بلانے پر بھی سامنے آنے سے ہچکچاتی تھی۔بہن کو گھر کا دروازہ اندر سے لاک رکھنا پڑتا تھا کیونکہ اگر علی گھر سے باہر نکل جاتا تو ذہنی معذوری کی وجہ سے اس قابل نہیں تھا کہ تھا کہ وہ اپنے گھر کا راستہ یاد رکھ سکے یا اپنے گھر والوں کا نام پتہ بتا سکے۔چند بار وہ گم بھی ہو چکا تھا۔علاقے میں سپیشل بچوں کا کوئی سکول نہیں تھا ان کو ایک پرائیویٹ سکول میں داخل کروایا مگر وہاں اکثر بچے ان کا مذاق اڑاتے۔ظاہر ہے یہ ہمارے کلچر کا حصہ ہے جہاں کسی کی آنکھ چاہے کسی حادثے میں ضائع کیوں نہ ہوئی ہو اسے ''کانا''، کسی کی ٹانگ خراب ہو جائے تو اسے ''لنگڑا''، کسی کا وزن بڑھ جائے تو وہ ''موٹا''، کوئی داڑھی رکھ لے تو وہ ''مولوی''، کوئی ذہنی معذور ہو تو اسے ''سائیں''، کوئی زیادہ سانولہ ہو تو اسے ''کالا''، اگر زیادہ گورا ہو تو اسے ''صاحب''، قد چھوٹا رہ جائے تو ''موچھا یا بونا'' یعنی اصل نام بھول کر اس کی شخصیت یا خدوخال میں سے کسی چیز کو بنیاد بنا کر اس کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔اسی طرح کسی شخص کا پیشہ بھی اس کے نام کے طور پر پکارا جاتا ہے مثلاً ٹانگے والا، رکشے والا، لوہار، رہڑھی والا، ماسٹر، استانی، فوجی وغیرہ۔مہذب معاشروں میں کسی کو ایسے پکارنا جس سے اس کی دل شکنی ہو ایک اخلاقی جرم تصور کیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر برطانیہ میں کوئی شخص چوری کرتا رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو اس کے خلاف اتنی سخت کارروائی نہیں کی جائے گی مگر وہ کسی پاکستانی کو ''پاکی'' یا کسی اپاہج کو ''لنگڑا یا کانا'' کہتا ہوا پکڑا جائے تو اس سے آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے۔زینہ اور علی کا سکول میں بچوں کی ٹیڑھی باتوں سے دل دکھتا، اگر دروازے میں بیٹھ کر محلے کے دیگر بچوں کو کھیلتا دیکھتے تو بچے ان کی معذوری کا ایسا مذاق بناتے کہ وہ احساس محرومی اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر کسی کے سامنے آنے سے کترانا شروع ہو گئے۔اولاد کی تندرستی ہر ماں باپ چاہتا ہے مگر کسی کے ہاں کوئی بچہ نارمل نہ ہو تو اس میں ان کا کیا قصور مگر ہمارے معاشرے میں لوگ اکثر ان کو ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ ان کا دل جلنا شروع ہو جاتا تھا۔مگر دل جب جلتا ہے تو اس کا شعلہ نہیں اٹھتا اور اس کا دھواں انسان کے اندر ہی گرتا ہے جس سے باقی اعضاء بھی متاثر ہوتے ہیں۔اب وہی بچے ہالینڈ میں ہیں اور ان کے والدین کو کسی نے یہ احساس نہیں دلایا کہ ان کے دو بچوں میں کوئی معذوری ہے۔بلکہ ان دونوں بچوں کو دوسرے دونوں صحت مند بچوں سے زیادہ پیار اور شفقت برتی جاتی ہے۔علی اور زینہ کو سپیشل بچوں کے سکول میں داخلہ مل گیا صبح گھر سے گاڑی لیکر جاتی اور سہ پہر کو بچے گھر چھوڑے جاتے۔پہلے دن جب سکول میں گئے تو والدین کو بھی ساتھ بلایا گیا اور سکول کی وزٹ کروائی گئی۔سکول کا نظام دیکھنے اور ذکر کرنے کے قابل تھا۔وہاں پر انسانوں کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ کتے بھی کام کر رہے تھے۔ہم دیسی لوگوں کو دیکھ کر دیکھتے رہنے کی بھی بری عادت ہے، جب

کتوں کے متعلق بتایا گیا کہ یہ ان بچوں کے ساتھ ڈیوٹی پر معمور کیے جاتے ہیں جن کو ہر وقت مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو یہ مخصوص تربیت یافتہ کتے ان بچوں کا دھیان رکھتے ہیں ان کے لیے کام بھی کرتے ہیں۔ کتوں کی خوبیاں بیان ہو رہی تھیں تو حسب عادت بہنوئی اور بہن نے کتوں کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا تو ہیڈ ٹیچر نے کہا کہ برائے مہربانی کتوں کو ایسے ٹکٹکی باندھ کر نہ دیکھیں ورنہ وہ مائنڈ کر جائیں گے اور ہم کسی کی دل شکنی کرنا جرم تصور کرتے ہیں چاہے وہ کوئی حیوان ہی کیوں نہ ہو۔ سکول کے ماحول میں چند دن گزارنے کے بعد بچوں کا اعتماد اتنا بحال ہوا کہ وہ میرے ساتھ اپنے سکول میں ہونے والے واقعات خوشی سے شیئر کر رہے تھے۔ علی جسے پاکستان میں ملنگ، درویش اور سائیں سمجھا جاتا تھا مجھے ڈچ زبان میں گنتی اور رنگوں کے نام بتا رہا تھا، زینہ پیانو پر دھن بنا کر سنا رہی تھی اور ساتھ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ وہ آرٹسٹ بنے گی۔ وہ اس بات پر بے حد خوش تھی کہ ان کی معذوری کا یہاں کبھی کسی نے مذاق نہیں بنایا اور نہ کسی نے ان کو یہ احساس دلایا ہے کہ ان میں کسی چیز کی کمی ہے۔ آنکھوں سے معذور فیصل آباد کے ڈاکٹر عامر علی ماجد برطانیہ میں آ کر ایل۔ ایل۔ بی آنرز، ایل ایل ایم لندن، ڈپلومہ ان ائیر سپیس لاء، ڈاکٹر آف سول لاء بیرسٹر، کرنے کے بعد لندن میں امیگریشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور قانون کی کتابوں کے مصنف بھی بنے، اپنی بھرپور کامیابی کا کریڈٹ ڈاکٹر صاحب برطانوی نظام اور معاشرے میں معذور افراد کے لیے یکساں مواقع کے قوانین کو دیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب لاہور میں ہوتے تو شاید نابینا افراد پر لاٹھی چارج میں اپنا حصہ لے چکے ہوتے۔ گزشتہ دنوں میاں صاحب لندن تشریف لائے جہاں انہوں نے ''اپنی رہائش گاہ کے باہر'' صحافیوں سے خطاب کیا۔ امریکہ کے ''کامیاب'' دورے کے بعد واپسی پر جب وہ دوبارہ اپنی ''رہائش گاہ'' تشریف لائے تو میڈیا کو رہائش گاہ سے دور ہی رہنے کا کہا گیا کیونکہ ہجوم ہونے کی وجہ سے اہل محلّہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ میاں صاحب کو اس بات کا احساس ہے کہ یہاں عوام کے حقوق سلب نہیں کیے جاتے اور ان کے آرام کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں انسان کے ساتھ حیوان کے حقوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کاش! ہمارے سیاسی اکابرین اور اشرافیہ کم از کم انسان بن کر دوسرے انسانوں کے لیے بھی وہی سوچ رکھیں جو وہ اپنے اور اپنے ایل عیال کے لیے رکھتے ہیں۔ کاش! ہمارے معاشرے میں بھی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ معذور افراد بھی جذبات رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت کا مذاق بنانے کی بجائے ان کو یکساں مواقع دے کر معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے میں مدد کرنی چاہیے۔ علی اور زینہ وطن عزیز سے کئی تلخ یادیں لے کر ہالینڈ میں آباد ہو گئے ہیں مگر اب بھی ہر گلی میں کوئی علی یا زینہ ہو گی جسے لوگ تند نظروں اور طنزیہ باتوں سے گھائل کرتے ہونگے۔ اس وقت دہشت گردی، معاشی دہشت گردی اور سیاست گردی جیسے مسائل پر قابو پانے کی باتیں کی جاتیں ہیں مگر اخلاقیات کی دہشت گردی پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ تمام قسم کے مسائل اخلاقی پستی سے ہی جنم لیتے ہیں اور اخلاقی پستی معاشی پستی سے جڑی ہوتی ہے۔ ہم نے کبھی خوش حال ہونے بارے چونکہ کوئی پلان نہیں بنایا تو ہر روز نکلنے والا سورج ہمیں بھوک کی نوید سناتا ہے اور ڈوبتے سورج کے ساتھ ہماری بہت سی خواہشیں بھی ڈوب جاتی ہیں۔ حقیقت میں قدرت کے طرف بے معذور ہونا ہوئی عیب نہیں کہ ابھی انسان اور پھر تیسری دنیا کا انسان تو اس کے سامنے بے بس ہی ہے۔ اصل معذوری تو اُن ذہنوں کی ہے جو تندرست ہونے کا دعوی کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اُنہوں نے ہر ذہن کو معذور بنا دیا ہے۔ ہر ریاست کی پہلی ذمہ داری اپنے شہریوں کا ذہنی معیار زندگی بلند کرنا ہوتا ہے تا کہ وہ دوسرے انسانوں سے مل جل کر زندگی بسر

کرسکیں اور کسی کی معذوری کا مذاق بنانے کے بجائے اُسے عام شہری سمجھتے ہوئے اپنے بہترین سلوک سے پیش آئیں۔معذوری جسموں میں نہیں اُن انسانی ذہنوں میں ہوتی ہے جن کی ریاست تربیت نہیں کرتی ورنہ ہالینڈ اور لاہور میں انسان ہی بستے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ان ریاستوں نے اپنے شہریوں کی بھرپور تربیت کر رکھی ہے اور ہم ابھی تک اُن کی تربیت بھی نہیں کر سکے جنہوں نے ریاست چلانی ہوتی ہے۔ بدترین معیشت نے پہلے ہی ہر پاکستانی کو ذہنی معذور بنا رکھا ہے اور دوسری طرف ریاست کی اپنے شہریوں کی تربیت نہ کرنے کی رسم نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔کوئی شخص اپنے مٹی کو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن جو مٹی اپنے لوگوں کو روزگار اور تعظیم نہیں دیتی لوگ پہلے اُس سے لاتعلق ہوتے ہیں اور پھر اُسے خیر باد کہہ دیتے ہیں۔اور سینے پاکستانیوں پر فخر کرنے والوں کے علم میں ہونا چاہیے کہ وہ کسی شوق میں نہیں بلکہ اپنے ملک کی معاشی معذوری کی وجہ سے غریبی الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

sohailloun@gmail.com

25-10-2015